



فہرست

صحت

۱. سائنٹ کٹر
۲. نئی زندگی

ادب و مزاح

۳. اکرم سہیل اور عصری تاریخ
چچی کہانیاں

۵. ہمارا گھر مندر بن گیا تھا
معاشرہ اور ثقافت

۷. اپریل فول، جھوٹ کا عالمی دن!
۹. لاہور ایک قدیم شہر
۱۰. مدر ڈے
-

سائنٹس کلر

مصنف: یوسف

یہ کسی فلم یا لکچٹ کا نام نہیں بلکہ دنیا بھر میں کئی انسان اس خاموش قاتل کے شکار ہیں اور یہ قاتل انسان کے وجود میں آنے کے بعد اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے انحصار اس بات پر بھی کرتا ہے کہ انسان کس خطے یا ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے روزمرہ کی مصروفیات کیا ہیں ، کیا معقول اور صحت مند غذاؤں کا استعمال کیا جا رہا ہے ، مکمل نیند لیتا ہے ، اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے ۔دنیا میں پچھلی بیماریاں قدیم ہونے کے ساتھ آج کل سائنس کی طرح ترقی بھی کر رہی ہیں سائنس اور ماہرین جتنا ان بیماریوں کی تہہ یا جڑوں میں جا کر ان کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے علاج کے طریقے دریافت کر رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے کئی بیماریاں انسانوں کی اپنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جنم لے رہی ہیں اور روز بروز کئی نئی بیماریوں کا شکار ہو کر انسان موت کے منہ میں جا رہے ہیں ، کسی نے زیادہ کھا لیا تو بیمار ہو گیا کم کھایا تو بیمار زیادہ خواب و خرگوش کے مزے لیتا رہا تو بیمار نیند پوری نہیں ہوئی تو بیمار یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسان کچھ کرے یا نہ کرے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ البرٹ آئن سٹائن معمولی لیکن خطرناک حد تک پیپٹ کی موٹی رگ کے پھیل اور سوچ جانے سے موت کا شکار ہوا تھا۔کئی بیماریوں کی اردو میں ٹرانسلیشن کرنا ناممکن ہونے کے ساتھ اردو میں لکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اگر حرف بہ حرف درست طریقے سے لیتی بچھ کر کے نہ لکھا جائے تو مطالعہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے تاہم ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ انگریزی کے حروف کی درست اور صحیح الفاظ میں ہامعنی لکھنے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح بھی کروں اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں اس کالم میں بھی کچھ ایسے پیچیدہ طبی الفاظ شامل ہیں جنہیں اردو رسم الخط میں تحریر کرنے میں کافی محنت کی ہے تاکہ دوران مطالعہ آسانی رہے۔حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق پیپٹ کے اندر چلنے والی قدیم بیماری کا واضح طور سے مطالعہ کیا گیا جس کے نتائج منفی ظاہر ہوئے ہیں ،جرمن ماہرین کا کہنا ہے صرف جرمنی میں جیشہ برس سے زائد کے افراد جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اس بیماری میں مبتلا ہیں،پیپٹ کی اس بیماری کو کسی بھی زبان میں ادا کرنا نہایت مشکل ہے جبکہ مکمل جانکاری حاصل کرنا اور زیادہ مشکل۔ایڈو میٹل اینیو رسم جسے آؤر تک اینیو رسم بھی کہا جاتا ہے ایک مہلک اور جان لیوا بیماری ہے۔زیادہ تر افراد اسکی علامات اور اثرات سے واقف نہیں کیونکہ یہ خاموشی سے جسم اور خاص طور پر پیپٹ میں نہایت خاموشی سے پروان چڑھتی ہے اور اسی لئے اسے خاموش قاتل یعنی سائنٹس کلر کہا جاتا ہے۔



جرمن ماہر ڈاکٹر لوڈل کا کہنا ہے جرمنی میں پانچ لاکھ افراد اس بیماری کے ابتدائی علاج کے دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ایک لاکھ مبتلا ہونے کے بعد زیر علاج ہیں نتائج آنے میں وقت درکار ہوگا۔طبی رپورٹ کے مطابق ان افراد کے پیپٹ کی خاص رگ پانچ سینٹی میٹر تک پھولی ہوئی اور سوجن ہے جس کے سبب وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے اور ایسے مریضوں کا فوری آپریشن لازمی قرار دیا ہے تاہم کچھ مریضوں کا علاج تفتیش کے بعد شروع کیا جائے گا،الٹرا سائونڈ سکین سے ڈاکٹروں نے اس بیماری کا پتہ لگایا ہے لیکن جرمنی میں صحت سے متعلق ہمارے سرچینگ کرنے کی ڈاکٹروں کو ادائیگی نہیں کرتے اسلئے کئی مریضوں کو خود ادائیگی کرنا ہوتی ہے جو ایک مہلک علاج ہوتا ہے تاہم روٹین چیکنگ کے دوران اتفاق سے بذریعہ الٹرا سائونڈ اگر معلوم ہو جائے کہ مریض اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسکی ادائیگی صحت کا ادارہ کرتا ہے روٹین چیکنگ میں پیپٹ کا الٹرا سائونڈ یا گردے کی تکلیف سے مراد ہے۔فیلی ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ جیشہ برس سے زائد افراد کو باقاعدگی سے الٹرا سائونڈ کروانا چاہئے اور خاص طور سے ان افراد کیلئے زیادہ اہم ہے جو مونپے میں مبتلا ہیں یا ڈیابٹیس ہونے اور کبھت تمباکو نوشی کرتے ہیں یا کمر کے درد کی شکایت کرتے ہیں۔پیپٹ کے اندرونی نظام میں اکثر معمولی انفیکشن سے بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ انفیکشن کی صورت میں رگیں اکثر زیادہ پھول جاتی ہیں یا اتنی کمزور اور ہارک ہو جاتی ہیں کہ پھٹ سکتی ہیں اور خون جاری ہونے کی صورت میں فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے ، زیادہ تر مرد اس بیماری میں مبتلا ہیں کیونکہ مردوں کی روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین سے مختلف ہوتا ہے مثلاً حفظان صحت پر زیادہ توجہ نہ دینا وغیرہ۔الٹرا سائونڈ سے فوٹوز حاصل کرنے کے بعد دوسرا قدم کمپیوٹر ٹومو گرافی سے مطلوبہ رگ کا پتہ لگانے کے بعد آپریشن لازمی ہوتا ہے ، پیپٹ چاک کرنے کے بعد زخمی رگ کے ساتھ مصنوعی عضو کلمپس لگا دی جاتی ہے جس سے خون کی سرکولیشن جاری رہتی ہے اور پوزیشن تبدیل کر دی جاتی ہے ، سینٹ گرافٹ کا استعمال کرتے ہوئے اینڈو ویس کیو لری کو بمبی نیشن سے رگوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور مریض تین سے سات دنوں میں فٹ ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر لوڈل کے مطالعے اور دستاویزی مواد کے پیش نظر ایک سو چوالیس افراد کے سینٹ گرافٹ آپریشن ہوئے اور دوہزار پندرہ میں اطالوی میگزین دی اٹالین جرنل آف ویسکولر اینڈوویس کیولر سرجری کے عنوان سے شائع ہوئے جس میں تصدیق کی گئی کہ یہ ہی سائنٹس کلر کا کامیاب علاج ہے ۔

§§§

نئی زندگی

مصنف: یوسف

۲۰ جنوری کو گیارہ بجے کلاس سے فارغ ہو کر گھر میں بات چیت ہو رہی تھی کہ بیٹ درد بلکی بلکی شروع ہو گئی، مقامی ڈاکٹر سے دوائی لی مگر آرام نہ آیا شام ۷ بجے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے میو ہسپتال بھیج دیا کہ منسلکین ہے ساتھ اپنے لیٹر پیڈ پر ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ٹیٹ کرنے کا بھی کہا۔ ٹیٹ کئے تو جگر کا منسلک سانسے آیا کچھ آرام آنے کے بعد ہسپتال والوں نے گھر بھیج دیا اگلے دن طبیعت مزید خراب ہو گئی شام فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے پھر میو ہسپتال میں اپنے میگزین کے ساتھی علی رضا کے ساتھ ہسپتال چلا گیا انہوں نے عارضی علاج کر کے آج پھر مجھے گھر بھیج دیا۔ اتوار کو طبیعت کچھ ٹھیک رہی پیر کو شام کو طبیعت سخت خراب ہو گئی فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو انہوں نے سب مریضوں کو چھوڑ کر مجھے چیک کیا تو انہوں نے کہا کہ ہسپتال والے آپ کو داخل کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ آپ کو کوئی سنگین منسلک درپیش ہے۔ آپ فوری ہسپتال جائیں پھر انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر سرکاری مہر کے ساتھ ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ہدایت یا آراء لکھ کر مجھے دیں۔ ہم ہسپتال پہنچ گئے ساتھ ہی ماموں ملک محمود الحسن، سرفراز، حق نواز، ملک قدیر بھی ہسپتال آگئے۔ ہسپتال امیر جنسی میں میڈیکل اور سرجری شعبہ جات کے ڈاکٹر اس بحث میں الجھ گئے کہ یہ ہمارا مریض نہیں ہے۔ مجھے ساتھی میڈیکل والوں کے پاس لے کر جاتے تو وہ کہتے کہ سرجری والوں کے پاس جاؤ سرجری والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ میڈیکل والوں کے پاس جاؤ۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک محمود الحسن ان لیگ لاہور کے جوائنٹ سیکرٹری نے بالال یا سین ایم این اے کو فون کیا کہ ہمارے مریض کو امیر جنسی میں علاج کی سہولت میسر نہیں بالال یا سین نے ہسپتال فون کیا تو علاج شروع ہو گیا مجھے ۱۰۳ بخار تھا اپنی حالت سے بھی لاعلم تھا ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس چل رہے ہیں زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اپنے خالق حقیقی کو کچھ دیر بعد ملے والا ہوں۔۔۔ رات کافی بیت چکی تھی وقت دیکھنا یا پوچھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اپنے آپ کا علم بھی نہ تھا اور یہ بھی علم نہ تھا کہ کہاں ہوں؟ ایک وقت ایسا آیا کہ حق نواز بھائی کو دیکھا جو پاس کھڑا انتہائی پریشان تھا مگر شدید بیماری کے باعث اس سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔

علاج کرتے کرتے دن کی روشنی نمودار ہو گئی مگر مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ مجھے بیڈ سے اٹھا کر کہیں لیجانے کیلئے سڑ پچر پر ڈالا گیا

لفٹ کے ذریعے بالائی منزل سے نیچے لایا گیا جب امیر جنسی سے باہر لایا گیا تو پھر سے پر ہارش کے کچھ قطرات پڑے تو احساس ہوا کہ مجھے کہیں اور لیجایا جا رہا ہے ایوب لینس میں رکھا گیا تو سمجھا شلد کسی اور ہسپتال میں شفٹ کیا جا رہا ہے میرا علاج کرنا میو ہسپتال والوں کے بس میں نہیں ہے۔ ایوب لینس نے پانچ منٹ کے بعد کہیں اتارا وہاں سے مجھے کہیں میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تو علم نہ ہو سکا کہ میں کہاں آیا ہوں البتہ چار پانچ گھنٹوں کے بعد جب کچھ حالت سنبھلی تو پتہ چلا کہ میو ہسپتال کی گورنوالہ وارڈ (ایٹ سرجیکل وارڈ) میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ۲۴ جنوری ۲۰۱۷ء منگل کا دن تھا۔ ہر روز ڈاکٹر صبح کو راولپنڈ کرتے چیک کر کے چلے جاتے، ٹیمٹوں کو روزانہ کی بنیاد پر کیا جانے لگا ایک دن وارڈ کے ہیڈ ڈاکٹر امیر افضل راولپنڈ کرتے ہوئے میرے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ اس حالت میں بغیر تشخیص کے جو بھی آپ کا علاج کرے گا وہ خود بھی پریشان ہوگا اور تمہیں بھی پریشان کرے گا۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تشخیص کیلئے بتائیں کہ ہم کیا کریں انہوں نے کہا کہ آپ M.R.C.P اور P.E.R.C.P کروائیں پھر ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے، میں نے استفسار کیا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیٹ ہو جائیں گے تو ڈاکٹر امیر افضل نے بتایا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں پر ان کی سہولت میسر نہیں ہے یہ سن کر میں حیران رہ گیا کہ اشیاء کے سب سے بڑے ہسپتال میں ان ٹیمٹوں کی سہولت موجود نہیں یہ ٹیٹ تو انتہائی اہم ہیں ان کی سہولت تو ہر سرکاری ہسپتال میں ہونی چاہیے یہ سہولت نہ ہونے کے باعث مریض تو بہت ذلیل و رسوا ہوتے ہوں گے حکومت کو چاہیے کہ ان ٹیمٹوں کی سہولتوں ملک بھر کے تمام سرکاری ہسپتالوں میں فراہم کرے۔

M.R.C.P تو سہنگ رام ہسپتال سے جلد ہی ہو گئی مگر E.R.C.P کروانا ہمارے لئے مشکل ترین کام ہو گیا کیونکہ اس ٹیٹ کیلئے جس سرکاری ہسپتال سے رابطہ کرتے تین ماہ دو ماہ، پندرہ کا نام ملتا۔ اتنی دیر انتظار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ۱۰۳ بخار دن میں دو سے تین بار ضرور ہوتا تھا جس سے حالت انتہائی خراب حد تک پہنچ چکی تھی۔ حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے مخلص ساتھیوں ڈاکٹر نجم الدین اور بریگیڈیئر (ر) محمد حنیف صاحب نے سی ایم ایچ سے ای۔آر۔سی۔پی کروانے کا فیصلہ کر لیا دو دن میں ہی یہ ٹیٹ اللہ کی توفیق اور مدد سے ہو گیا۔ سی ایم ایچ کے ڈاکٹر نے چھوٹی پتھریاں نکال دیں ایک بڑی پتھری رہ گئی جو آپریشن سے ہی نکل سکتی تھی۔

دونوں ٹیمٹوں سے جو تشخیص ہوئی وہ یہ تھی کہ جگر کے باہر ایک جھیلی بن گئی ہے اور سی۔پی۔ڈی میں پتھری ہے اور آنتوں میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ ۱۶ جنوری کو آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا حسب معمول ای دن آپریشن ہو گیا یہ آپریشن ڈاکٹر امیر افضل صاحب نے پوری محنت و توجہ اور پیشہ وارانہ

تجربے سے کیا۔ حالت نازک ہونے کے باعث آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا جہاں چھ دن تک زیر علاج رہا۔ پھر باہر شفٹ کر دیا گیا آپریشن کے بعد ڈاکٹر وزیر حسن جیسا نرم دل، صحتی معالج ملا جنھوں نے شب دروز ایک کردینے پھر پور توجہ دی ڈاکٹر ذیشان سرور، ڈاکٹر کاشف، ڈاکٹر حنیف کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا نرسنگ سٹاف میں سے کلینک بھائی اور دیگر نرسز کی شبانہ روز محنت نے علاج میں اہم کرلور ادا کیا۔ چاروں وارڈ میں رہنے کے بعد ۲۵ جنوری کو ڈسچارج کر دیا گیا مگر ڈرین اور ٹی ٹیوب نہیں نکالی کیوں کہ ڈاکٹر امیر افضل نے ڈاکٹر کو کہا تھا کہ اس مریض کی یہ دونوں نالیاں لگی رہنے دیں جب تک ریڈیالوجی کی رپورٹ نہیں آجائی۔

ریڈیالوجی کی رپورٹ کے بعد آپریشن تھیز میں بلوایا گیا جہاں ڈاکٹر نے رپورٹ کا مطالعہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ابھی دو پتھریاں مزید ہیں صبح وارڈ میں آئیں اگلے دن وارڈ میں گیا تو ڈاکٹر امیر افضل نے رپورٹ دیکھی تو کہا کہ یہ رپورٹ بتا رہی ہے کہ پتھریاں نہیں ہیں جن کو پتھریاں کہا جا رہا ہے وہ درحقیقت پتھریاں نہیں ہیں۔ باقی نالیوں بھی نکال دی گئیں چوبیس گھنٹے وارڈ میں ٹھہرنے کا کہا اگلی صبح راولپنڈ کے دوران مختصر ملاقات کے بعد گھر بھیج دیا گیا۔ چند دن کے بعد فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر عدنان سرور سے ملاقات کی تو انھوں نے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس الٹراساؤنڈ کیلئے ریفر کیا۔ الٹراساؤنڈ کیا گیا تو رپورٹ وہی تھی جو ڈاکٹر امیر افضل نے کہا تھا۔ علاج کے دوران یہ بات خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ چھوٹے درجے کے عمل کی تربیت کا شدید فقدان ہے۔ وارڈ میں لواحقین کے خشنے کیلئے ڈیسک، پرانے خستہ حال بیڈز اور گدے عوامی خدمت کی دعوے دار حکومت کو منہ چڑھا رہے تھے۔ علاج کے دوران اسلامی اخوت و موانعات کا عظیم مظہر دیکھنے کو ملا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کی حفاظت فرمائے جنھوں نے بیماری کے دوران راقم کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعاون کیا۔

اکرم سہیل اور عصری تاریخ

مصنف: یوسف

کہتے ہیں کہ ایک بار اشرف صہبی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے۔ وہاں انہوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی جو کسی الماری میں تالا بند تھی۔ حفیظ جالندھری صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔۔۔ بیگم ذرا چابی دینا، ایک کتاب نکالنی ہے۔ اس پر صہبی چپک کر بولے "ہاں ہاں ضرور چابی دیجیے یہ بھی اب چابی کھلونا بن گئے ہیں۔ چابی کے بغیر چل نہیں سکتے۔"

یہ تو گئے زمانوں کی بات ہے جب نیکالوینی ذرا کم ترقی یافتہ تھی اور ان دنوں مارکیٹ پر جاپان چھایا ہوا تھا۔ اب معاملہ ذرا اور آگے بڑھ گیا ہے۔ ایک طرف چین کا سایہ ہے تو دوسری طرف ریوٹ کا دور دورہ۔ اسلئے اب ہمیں ہم تم کرسے میں بند ہوں اور چابی کھو دیں جیسے گیت سننے کو نہیں ملتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب "سچ" سسٹم چل رہا ہے۔ سواب "سچ" ہی ناث "بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تو صہبی کا ٹھٹھا لپٹی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ اب عمومی طور پر سوچ و عمل کے باب میں کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ صاف نظر آتا ہے کہ ریوٹ کہیں اور ہے حرکت کہیں اور۔۔۔ اس بے حس و جلد کیفیت میں کچھ فرزانے بلکہ دیوانے ایسے ہوتے ہیں جو "کل جاسم سم" کا اسم اعظم الاپتے سناٹے دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں۔ کہ شاید کہیں کوئی جنبش ہو اور کوئی روک بندش کھلے۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ جو کہنے کو کئی سال بیوروکریسی میں گزارا بلکہ گنوا کر آیا ہے۔ لیکن ایسا کمال "نیا" کہ برسوں پہلے دیکھے خواب سنہالے پھرتا ہے۔ اسے گمان ہے کہ اس کے خواب نئے اجالوں کے سفر ہیں۔ اس کا گمان وقت کے ساتھ ساتھ اہتقان میں بدلا سو وہ کہنے کے قابل ہوں۔

میں وہ جانتا ہوں حقیقتیں جو اس ارض بے نوا کی ہیں گر دل میں رکھ کے ہی سو گیا تمہیں کون پھر یہ بتائے گا اس نے اپنے خوابوں کا اتساب کچھ ایسا کیا کہ سب ظاہر باہر ہو گیا۔ مشہور پہلاڑی آخان ہے کہ "جہنیاں ناں ہالا نیدری اسے اپنا" اس کی فکر و شاعری کے باب میں یہ آخان مکمل طور پر صادق آتا ہے کہ اس کا حرف حرف لفظ لفظ اس کی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

وہ "حمہ" لکھتا ہے تو کہتا ہے کسی نے لو جو لگائی تو اس کو دار ملی کہیں تو نوک سناں تن کے آر پار ملی وہ تیرے نام کا صدقہ اتارنے کے لئے دیا تھا دل تو چلے جان وارنے کے لئے اور "نعت" کہے تو یوں گویا ہوتا ہے۔ قاطع عہد غلامی وہ دبیر اور نذیر عہد ظلمات میں وہ شمس الضحیٰ کی تجویر ظلم کا ہاتھ جھٹک دینے کی توفیق ملی بند سوچوں کو بھی پھر جرات تحقیق ملی غالباً

اسی متحرک سوتے سے تحقیق و تحقیق کی جرات پا کر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اس کا اسم اعظم کام کر جاتا ہے۔ وہ کھل جا سم عم کہتا ہے تو ملکی حالات، تاریخ، تحریک اور سیاست کے بند در اس کے سامنے کچھ یوں دباوتے ہیں کہ وہ سات پردوں میں ہونے والے معاملات کو بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس کی پرکھ کی یہ صلاحیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ مجھے "مکایت" کے صابر راجپوت کی کہانیوں کا "کھوجی" لگتا ہے جو کھرا اُٹھتا ہے، تو ملکی وسائل لوٹنے والوں کے گھر تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سمجھ بوجھ کو جب اپنی اہلیت اور فنی ریاضت کے سہارے شاعری کا بیڑا ہن پھاتا ہے تو وہ سنور کھھر کر یوں سامنے آ جاتی ہے کہ سیاہ اندھیرے میں چاندنی سی چمک چمک بن جاتی ہے۔

وہ فکر ی طور پر رائج ہے سو اسے کر بلا حریت کا استعارہ لگتا ہے اور اسے یہ جرات بھی حاصل ہے کہ وہ فیصلے سے پوچھ پائے کہ "کب راج کرے کی خلق خدا" حریت اور رفیق کا تذکرہ آیا تو یہ کہنا حق بنتا ہے کہ وہ ترقی پسند فکر کا حامل شخص و شاعر ہے اسی لئے اس کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے اور وہ جرأت و ہمت کو رجسٹر کر کے خلق خدا کی حالت بدلنے کی آس رکھتا ہے۔ وہ شہر کے قلم کاروں کو حرمت لفظ کا امین بتاتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ "جتنی روح اوہے ہے فرشتے" یعنی جیسا تو ویسے حکمران ہلا۔

! اہن انشا کا کہنا ہے کہ حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا سو ہم بحیثیت مجموعی وہ محتاط و متناقض لوگ ہیں جو ہر سو ظلم کی پادشاہی دیکھ کر اسے غلط تک کہنے سوچنے سے بھی گریزاں ہیں کہ مبادا یوں نہ ہو جائے مبادا دوں نہ ہو جائے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ اس "احتیاط" سے ممکنہ طور پر بچا رہا ہے۔ اور اس کی یہ علالت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ لہذا اس کا لکھا حرف حرف لفظ لفظ، شعر، نظم، قطعہ، غزل سبھی کچھ ایک خاص فکر کا غماز ہے۔ وہ اب برائے زندگی کا قائل بلکہ اس سے گھٹا ہے۔ سو اس کے سارے موضوعات زندگی بلکہ کرب انگیز زندگی سے کشید ہوئے ہیں۔ اسلئے اس کی شاعری میں صداقت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ وہ جانتا ہے کہ "حکم شامی" یوں ہی ملتا ہے۔

حکم شامی ہے مرا جشن منایا جائے میرے ارمانوں کا ایک تخت بچھایا جائے میرے احکام کی قہیل مگر ہو ایسے ہی تحقیق کسی کاغذ پہ نہ لایا جائے ایسی ہستی کہ جہاں لوگ ہوں گستاخ بہت ایسا گھر کوچہ و بازار جلایا جائے* وہ بھی کچھ ایسا ہی "گستاخ" ہے مگر اس نے ہر بات نہایت جھوڑ پنے سے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فکر عمومی طور پر اس کے بیان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

یوں تو "نئے اجالے ہیں خواب میرے۔" دس حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے تمام حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ اس کا موضوع مظلوم ملک و لوگ ہیں اور مظلوموں

کے درد سانچے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فطری اتحاد ہونا بھی لازمی امر ہے لیکن اس کے دو خصوصی حصے جو کشمیریات یعنی کشمیر کی تحریک آزادی اور یہاں کے قومی مسائل کی لوٹ کھسوٹ کا احوال بیان کرتے ہیں، خاصے کی چیز ہیں۔

کہتے ہیں کہ افغانستان کے جہاد اور روس کے سقوط کا اصل سبب کشمکن میں پایا جانے والا سنہری سیال ہے۔ اس طرح ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا میں آئندہ جنگیں پانیوں پر ہوں گی۔ ان دو حوالوں کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جائے تو گزشتہ کئی سالوں سے کشمیر کی مابوں اور نالوں پر قبضے کا ایک خاموش عمل آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل وہ ہے جسے اس نے "واٹر لاندزنگ" کا نام دیا ہے۔ اس نے پہلی بار اس اہم اور بے حد حساس معاملے کو دیکھا اس پر سوچا اور پھر پوری جرأت سے لکھا۔ یوں مجھے اس کی شاعری کشمیر کی عصری تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس عصری تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو مجھے شعوری طور پر یہ عمل ایک نئے کشمیر کی دریافت لگتا ہے۔

اکرم سہیل کی شاعری میں نظم و قطعے کا پلا ذرا بھاری ہے۔ اس کی نظم ہنگامی و موضوعاتی نوعیت کی ہے۔ یوں وہ مولانا ظفر علی خان کی راہ کا راہی کہا سکتا ہے۔ لیکن بلند آہنگی اور پر شکوہ انداز کے باعث اور غالباً فطری میاں میں یکسانیت کے سبب وہ غیر محسوس انداز میں جوش کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی نظم و قطعے کا باہم مطالعہ گزشتہ دو تین دہائیوں کی تاریخ کے وہ در واکرتا ہے جو عمومی طور پر ڈاڈے ہائے کر کے بند کر دیے جاتے ہیں۔

اپنی طبیعت اور شخصیت میں وہ علم و متوازن شخص فیض اور احمد ندیم قاسمی کا مقلد لگتا ہے۔ فیض جو اب برائے زندگی کے قافلے کا سرخیل تھے کہ متعلق کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ وہ علم، حلم اور نظم کا آئینہ تھے تو اسی طرح رب کی مہربانی سے کھلی آنکھوں سے ندیم کو بار بار دیکھا تو یہ جانتا کہ فنی ہنرمند اور سلیقہ شاعری کیا ہوتا ہے۔ اکرم سہیل شخصی حوالوں سے ان سے متاثر لگتے ہیں لیکن مزاحمتی شاعری میں ان پر غالب ذرا زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ شاید حالات کی سختی اور تخلیقی نے ان کے سچے کو ذرا تند کر دیا ہے، ورنہ یوں تو وہ ریلے بیٹھے شخص ہیں۔

اکرم سہیل جب کشمیر کہانی کہتے ہیں تو وہ یہاں کے بپتے پانی کو نہیں بھول پاتے جو ہائڈرل جزیئن کی چٹکاری کی صورت میں دے دیا گیا۔ اسی لئے ان کا کہنا ہے۔

نالہ صدیوں سے ہے دلگیر میرا جسم بھی پابہ زنجیر میرا جس کے پانی پہ میرا حق یہ نہیں کیسے کشمیر و ہ کشمیر میرا مسئلہ کشمیر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کیا رخ بھی یہ دیکھا ہے کشمیر کہانی کا باقی ہیں یہ سب نعرے مسئلہ ہے یہ پانی کا یا پھر میری دھرتی کی ایک ہی دولت ہوس زر کا وہی شکر ہوئی کیسے قبضے میں غیر کے آئی یہ حقیقت بھی

آشکار ہوئی اکرم سہیل نے کشمیر کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کو پہلی بار موضوع شاعری بنایا۔ سو وہ کہتے ہیں۔
میرے دریاؤں کی باتیں ، میرے اشجار کی باتیں میرے یا قوت کی باتیں، میرے مرجان کی باتیں جو ہو قومی وسائل لوٹنا مقصد ہی جب ان کا کہاں بھاتی ہیں ان کو قاعدہ قانون کی باتیں اکرم سہیل کی شاعری یقیناً کشمیر کے مزاحمتی ادب میں ایک بامعنی اضافہ ہے۔ جس کی گونج ہمیں جلیترنگ دور اور دیر تک سنائی دے گی۔ کہ اس میں کشمیر کے بچے جھروں اور گنگناتی ندیوں کا ترنم و الم ہے اور اس کی تاثیر یقیناً گہری اور ڈاڈی ہے۔ کہ یہ دھرتی کے سینے پر رقم وہ تحریر ہے جسے محسوس کئے بنا آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

§§§

ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

مصنف: یوسف

ایک مضمون دیکھئے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ ’’گھروں سے دریافت ہونے والی عجیب اشیا، کوئی کالا مال تو کوئی خوف سے نڈھال‘‘

اس میں مغربی ممالک میں مختلف گھروں سے پرانے کینوں کی چھوڑی ہوئی اشیا کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آسٹریا میں کسی گھر میں کینوں کو ہاتھ روم کی دیوار سے ایک کوریائی میزائل ملا۔ ایک امیر جرمن باشندے کو اپنے گھر کے تہ خانے سے جنگ عظیم کے دور کے ہتھیار ملے جن میں ایک ٹینک اور توپ بھی شامل تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے ملک چیک ری پبلک میں گھر کے اندر کسی کام کے سب کھدائی کی گئی تو کسی گرجا گھر کی چار صد سال پرانی گھنٹی ملی۔

لیکن یہ حیرانی کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی اشیا نکلتی رہتی ہیں۔

اور ایسی ہی کچھ اشیا مجھے ہامی کی واپسوں میں لے جا رہی ہیں۔۔۔ نوشہی۔ بلوچستان کا ایک دور افتادہ مقام ہے جو تقریباً ایران جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ انگریزوں نے نہایت ہی منصوبہ بندی سے بنایا تھا۔ تمام سڑکیں گلیاں کشادہ اور ایک دوسرے سے قائمہ زاویہ بنائی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ 1954ء - 55ء کا زمانہ تھا۔ ہم اسی خوبصورت قصبے میں رہتے تھے۔ مکان کا نمبر بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ 102 تھا۔ انگریزوں نے اپنے لئے ایک ٹینس کورٹ بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر ہم خانے بنا کر اسٹاپو وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو کافی تعداد میں تھے کیونکہ ارد گرد کے علاقوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ہندو اس تجارت کے کرتا دھرتا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کافی تعداد میں ہندو یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی ایک کافی تعداد رہ گئی تھی۔

ایک دن اباجان مرحوم نے گھر کے صحن میں کیاری بنا کر مختلف پھول لگانے کا ارادہ کیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی کی۔ ہم بچے بھی اباجان کا ساتھ دے رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر قریب ہی ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر پیچھے گرا۔ میں چونک گیا کہ پوری مٹی میں پتھر نہیں تھا یہ کہاں سے نکل آیا۔ اسے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ بھائی جان جو قریب ہی کھڑے تھے انہیں بھی تجسس ہوا اور وہ بھی کام چھوڑ کر میرے قریب آگئے اور اسکی مٹی صاف کرنے لگے۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک گائے کی شکل کا کھلونا تھا۔

میں اس وقت چار پانچ برس کا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اس سے کیلیں شروع کر دیا۔

اباجان مرحوم نے کیاری میں بیج بونے۔ ایک دو بیجریاں بھی اباجان مرحوم نے کہیں سے لا کر لگا دیں۔ ایک دو دن گزر گئے۔ ہم نے گائے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

نہ جانے ہندوؤں کو کیسے اس کا علم ہو گیا۔

غالباً باجی مرحومہ یا بھائی جان میں سے کسی نے اسکول میں میں تذکرہ کیا تھا اور کسی ہم جماعت کو وہ گائے دکھائی بھی تھی۔

اس کے بعد تو ہندو خواتین کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا چیزیں لے کر آئیں، اور اس مقدس پوتر دھرتی

جہاں سے لکڑی کی گائے نکلی تھی کہ پھیرے لگا تیں۔ پھر کسی ناییدہ ہستی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتیں اور سر نہوڑائے بیٹھ

جاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں کوئی اشولک پڑھتیں۔ اس کیاری کی مٹی کو اپنی انگلی سے چھوتیں اور نہ جانے کیا رسومات کرتیں

۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی ہوتی تھی اسے ہلکی ہلکی آواز میں بجاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جب والدین نہ ہوں

اس وقت آئیں اور اپنی رسومات ادا کریں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کا تو ہم بچوں کو علم نہیں تھا لیکن ان کے آنے سے ہم خوش

بہت ہوتے تھے کیوں کہ وہ طرح طرح کی مٹھائیاں ’لڈو وغیرہ پیتل کی تھالیوں میں رکھ کے لائیں اور کیاری کے گرد ان کو

لیکر گھومتیں اور ہمیں بھی پرشوہے کہہ کر دیتی تھیں۔ ہمارا گھر تو ایک قسم کا مندر بن گیا تھا۔ بعد میں اسی آئیں تو ہمیں بہت

غصہ ہوتی تھیں۔ خیر بعد میں اباجان نے وہ گائے وہاں کے ایک معتمد ہندو کو دے دی تھی۔ ہندو اس مقام سے بہت سی

مٹی بھی کھود کر لے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پوتر مٹی ہے۔ اس کے بدلے میں ہندوؤں نے کہیں اور سے مٹی لا کر

ڈال دی تھی۔

اس طرح کا ایک قصہ ابن صفی (مشہور جاسوسی ناول نگار۔ عمران فریدی اور کپٹن حمید کے کرداروں کے خالق) کے فرزند جناب

احمد صفی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی میں نانا ابو کو جو گھر فوج کی طرف سے الاٹ ہوا وہ اس سے قبل کسی

ہندو خاندان کا تھا جو ہجرت کر گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے بتایا کہ ایک کمرے کی دیوار دھری بنی ہوئی تھی اور اس پر ہاتھ

مارتے تو پیسے برتنوں کے جھنجھٹانے کی آواز آتی تھی۔۔۔ نانا ابو کے سخت حکم کی وجہ سے کسی نے بھی اس دیوار کو نہ چھیڑا۔

بعد کو جب یہ مکان کسی اور کو بیچا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس دیوار کو قودا تو اندر سے گر ہستی کا پورا مسلمان برآمد ہوا

۔ شلڈ کسی کے جہیز کے لیے رکھا گیا تھا۔۔۔ اور نہ جانے اس مسلمان کے علاوہ کیا کیا نکلا ہو جس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔۔۔

ہجرت کے زمانے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ جنگ اخبار کے کالم "ناقابل فراموش" میں بھی چھپا تھا۔ ایک مسلمان خاندان

بھارت سے ہجرت کر کے آیا تو اس خاندان کو کراچی میں کوئی فلیٹ الاٹ ہوا۔ وہ اس میں رہنے لگے۔ ایک دن کسی نے

دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے اور ہجرت سے پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا

۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہندو ہے۔ دو تین دن فلیٹ میں آتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے راز دارانہ انداز میں کہا کہ اس کے

پاکستان آنے کا ایک مقصد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے والے اس خاندان کے اخلاق، کردار اور ایمانداری کی بہت تعریف

کر رہے تھے۔ اس ہندو نے کہا کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اسے امید واثق ہے کہ مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔

اس تمہید کے بعد اس ہندو نے کہا کہ ہمارے کے وقت جب وہ ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے پاس بہت سا سونا تھا لیکن اس

وقت کے حالات میں اسے لے جانا بہت دشوار تھا۔ آخر اس ہندو کو ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ سونا اسی فلیٹ میں چھوڑ دیا

جائے اور بعد میں حالات صحیح ہو جائیں تو لے جائے۔ اس ہندو نے سونے کو ہارڈک سی تار میں تھپیل کیا اور گھر کی چھت اور

دیواروں میں بچھی ہوئی بجلی کی تاروں کے ساتھ ساتھ یہ سونے کی تار بھی بچھا دی۔ اس ہندو نے کہا کہ اب اسکی بہن یا بیٹی کی

شادی ہے اور وہ اس امید پر پاکستان آیا ہے کہ اسے اپنا سونا مل جائے گا

پاکستانی نے ابھیر کسی تردد کے کہا "مجھے تو اس کا علم نہیں لیکن جناب یہ آپ کی لمانت ہے۔ آپ بلا کسی تامل کے اپنی لمانت

لے جا سکتے ہیں"

ہندوستان سے آئے ہوئے فرد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر آیا تھا کہ نئے مالک مکان کو اس میں سے نصف

حصہ دے دے گا لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ خیر قصہ مختصر سابق مالک نے پوری رات لگا کر بجلی کی تاروں

کے ساتھ لگا ہوا اپنا سونا نکال لیا۔ اس نے نئے مالک مکان کو ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی لیکن پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ

شے جس کا مکان سے کسی طرح کا تعلق ہی نہیں بنا وہ کیسے لے سکتا ہے۔

قصہ مختصر ہندوستانی باشندے نے سونے کی تاریں لیں۔ اس نے جانے کیا انتظام کئے تھے کہ بخیریت اپنے ملک چلا گیا۔ وہاں جا

کر خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دو مہینے بعد اس کی طرف سے شادی کارڈ بھی آیا جس میں اس پورے پاکستانی

خاندان کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

ناقابل فراموش میں شائع شدہ کہانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ غالباً 1960 یا 1961ء کا قصہ ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ

جب وہ مشرقی پنجاب یا بھارت کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور الاٹ شدہ مکان میں داخل ہوئے تو ایسے

گلتا تھا کہ اصل کمین کہیں نزدیک ہی گئے ہیں۔ جانے والے ہندوؤں کو کامل یقین تھا کہ واپس اپنے گھروں میں آئیں گے

- قرہ الامین حیدر اپنی کتاب ”روشنی کی رفتار“ صفحہ 116 پر
لکھتی ہیں کہ جب اسپین سے مسلمان نکل کر مراکش پہنچ رہے
تھے تو وہ اپنے اندلی گھر کی چابیاں مراکش میں دیواروں پر
ٹانگ دی تھیں انہیں امید تھی کہ واپسی ہو گی۔

§§§

اسی طرح ہمارے صحافی بھائی ،انٹیک پرسن ،کالم نویس ،بھی ہر روز ہم عوام کے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں ،اس کو چھوڑیں عوام بھی جہاں جہاں بس چلتا ہے ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول مناتی ہے ،عام آدمی بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اب مجھے یقین نہیں ہے لیکن کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے ۔



جس نے یہ رپورٹ لکھی تھی اسے شہد علم نہیں تھا کہ پاکستانی جھوٹ بول کر خوش بھی ہوتے ہیں اس لیے پاکستانیوں کے لیے تو ہر دن ہی اپریل فول ہے۔ دو نمبر مال دے کر ،زیادہ پیسے لے کر ،ملاوٹ والی چیزیں بچ کر ،جھوٹے مقدمات بنا کر ،ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول ہی مناتے ہیں ۔

اس لیے یہ دن ان کو منانا چاہیے جہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا چلو ایک دن جھوٹ بول کر دل پشوری کر لیں۔اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن کی نقل میں ہم اپریل فول مناتے ہیں وہ کم جھوٹ بولتے ہیں۔ پاکستان میں تو اس دن کو منانا اس دن کی توہین ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر روز منایا جاتا ہے، سب سے منایا جاتا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ مغرب خصوصاً اہل یورپ افراد معاشرے کے ساتھ عملی مذاق اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے ایک مخصوص دن میں یہ تہوار مناتے ہیں ۔جھوٹ کے دن پورا بچا ہے کہ ہمارے بال ہر روز یہ دن منایا جاتا ہے ۔

ہم بات کر رہے تھے کہ پاکستانی معاشرے کی اس کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے ۔اس کی ایک وجہ تو اوپر لکھی ہے عارضی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ دوسروں کو حقیر جاننا بھی اس کی ایک وجہ ہے ۔اپریل فول میں ایسے کام کیے جاتے ہیں جن میں انہیں حقیر جاننا گیا ہے بلکہ انہیں حقیر سمجھنا ہی ان سے مذاق کرنے پر ابھارتا ہے لوگوں کو اسحق قرار دینا۔ ہم خود دوسروں سے اعلیٰ خیال کرتے ہیں ۔

اسی خالی سے کم ہی بچے ہوں گے ہمارے سیاست دان ،صحافت ،اور عام آدمی بھی دوسروں کو گھٹیا یہ خیال کرتا ہے جیسے جھوٹ نے ہمارے معاشروں کو برباد کر دیا ہے ایسے ہی ستمبر ہے اور اس رسم اپریل فول میں یہ دونوں برائیاں پائی جاتی ہیں ۔آج ہمارے معاشرے میں یہ اپریل فول منانے کی وہاں دیگر بہت سی وباؤں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے ہمارے نوجوانوں کی اکثریت اسے بغیر سوچے سمجھے قبول کر رہی ہے، اس کی ایک وجہ مغرب کی بیرونی بھی ہے کیونکہ ہمارے نوجوانوں کی اکثریت مغرب سے متاثر ہے ،ہمارے نوجوان خود کو جدت پسند کہلانے

کے لیے بھی یہ دن منا رہے ہیں ۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان سپین میں مسلمانوں کے قتل عام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے واقعہ کی یاد میں یہ دن نہیں مناتی ۔

ہمارے ذرائع ابلاغ سے اگر مناسب طریقے سے عوام کے لیے آگاہی مہم چلائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان

اپریل فول میں تو ایک تو جھوٹ بولا جاتا ہے اوپر سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے ۔اس کی خوشی منائی جاتی ہے۔

اس رسم اپریل فول میں جھوٹ بولا جاتا ہے دوسروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، دھوکہ دیا جاتا ہے، غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے ،تکبر کیا جاتا ہے ۔جھوٹ بول کر دوسروں کو پریشان کیا جاتا ہے ۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے ۔

دوسری حدیث میں ہے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے ۔ تیسری حدیث میں ہے کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے ۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کے شرانگیز ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی مسلمان بھائی کو حقیر جان لے ۔مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں ڈھاتا وہ اسے رسوا نہیں کرتا اور نہ وہ اسے حقیر جانتا ہے ۔اور یہ سب برائیاں ایک اپریل فول منانے میں موجود ہیں ۔

اس دن کو منانے سے دشمنان اسلام کی خوشیوں میں شرکت کا گمان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر انسان گناہ کبیرہ یعنی جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب رہ گئی پاکستان معاشرے کی بات کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے ۔اس کی بہت سی وجوہات ہیں ۔ مختصر یہ کہ خوشی کے لیے ،حالانکہ جھوٹ بول کر خوشی منانے کا کیا جواز ہے ، لیکن ہمارے معاشرے میں جھوٹ بول کر ہی خوشی منائی جاتی ہے ،روزہ روٹی کمانی جاتی ہے ،کاروبار کیے جاتے ہیں سیاست و صحافت چمکانی جاتی ہے ۔دوسروں کو بے وقوف بنا کر ہم لذت حاصل کرتے ہیں ،خوشی حاصل کرتے ہیں ۔یہ بھی کہنا ہے کہ جھوٹ بولنا اب ہمارے معاشرے میں گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا ۔حالانکہ صلاح ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا ۔ہمارے سیاست دان روز ہم سے جھوٹ بولتے ہیں یعنی روز ہمارے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں ۔



اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !

مصنف: یوسف

یکم اپریل کو جھوٹ کا دن منانے کے بارے میں مختلف قسم کے واقعات ملتے ہیں، جس سے علم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی ۔ اپریل لاطینی زبان کے لفظ اپریل یا اپرائر سے ماخوذ ہے ۔ مطلب ہے پھولوں کا کھانا ، قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی یا دیوی کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے، ترنگ میں آتے اور جھوٹ بولتے۔ آگے چل کر یہ دن اپریل فول کہلایا۔ اپریل فول 1508ء سے 1539ء تک صرف یورپ میں منایا جاتا تھا اور انھارویں صدی میں برطانیہ میں منانے لگے اور اب چند سالوں سے پوری دنیا میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔



اپریل فول کا تذکرہ سب سے پہلے ایک انگریزی اخبار ڈریک نیوز لیٹر سے ملتا ہے یکم اپریل 1846ء کو اپریل فول کے موقع پر یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں سے ایک اہم اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ 31 مارچ کو ایک انگریزی اخبار میں یہ خبر آئی کہ کل شہر کے زراعتی فارم پر گدھوں کی عام نمائش ہوگی اور میلہ ہوگا تو لوگ خوش و خرم وہاں جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے ۔ جب لوگ انتظار کر کر کے تھک گئے تو پوچھنے پر بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے آئے ہیں وہی گدھے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کو ہر سال 2 اپریل کی اخبارات میں دیکھا جا سکتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جھوٹ بول کر کیسے لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے ۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اپریل فول منانا جائز نہیں ہے ۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، یہ منافقت کی نشانی ہے، اور

سے اس رسم بد کا خاتمہ نہ کیا جائے آخر میں قرآن پاک کی سورۃ الحجرات کی ایک آیت کا مفہوم۔ اے ایمان والوں کوئی قوم کسی کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ (جن کا مذاق اڑایا جاتا ہے) ان سے بہتر ہوں، نہ عورتیں ہی دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ، نہ کسی کو برے لقب دو اسلام لانے کے بعد فتنہ بہت ہی برا نام ہے جس نے توبہ نہ کی وہی ظالم لوگ ہیں۔

§§§

شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس چلک شامل ہیں۔

مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمیرات نصر الدین مرآت خان نے تیار کیا۔ تعمیر کا کام میاں عبدالحق اینڈ سیٹی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔ 21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔



بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔ مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ کٹ لینا پڑتا ہے۔ اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے بڑے سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے بچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔

§§§

لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: یوسف

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی خود مسلمانوں کی۔ اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن سائل مالا بار کی ریاست گدگد نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواہیں بھیلنے لگیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اور نگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نا اہل چاشنیوں کے باعث برطانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے گلہ جوڑ کرستے ہوئے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔



لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دار الحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس الہند لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر بلوچ، حسین، حضرت شاہ ابوالمعالی، حضرت موح دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیاں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن

مدر ڈے

مصنف: یوسف

تمہیں آیا تو میں نے پوچھا آج ایسا کون سا خاص دن ہے؟ پاپا! آج مدر ڈے ہے، چھوٹے نے آواز لگائی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ پھر اس پر بحث ہونے لگی کہ کون سا بچہ اچھا ہے۔ کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ معلوم۔ میں کچھ دیر تک توسل کرتا رہا اور پھر خود بخود میرے پاؤں ان کے گھر کی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہر ہی مل گئیں۔ کسی ہیں آپ ماں جی..... بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی..... جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آگیا۔

اور ہاں ایک اور بات..... میں آپ کو "وش" کرنے آیا ہوں۔ کس بات کی "وش"؟ انہوں نے پوچھا۔ ماں جی! آج مدر ڈے ہے ناں۔ جیتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو، خوشیاں دیکھو۔ ان کی آواز کا بیروم میں کیسے تحریر کروں اور ان کے آنسو کیسے صفحہ پر نکلیں۔ توڑی دیر آسمان کی طرف نکلی ہاتھ کر دیکھتی رہیں، بالکل گم سم۔ آپ ٹھیک تو ہیں ماں جی! میری آواز سن کر چونک سی گئیں اور وہاں اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ اب تو تمہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی پیپڑی آگئی ہے، کیا تمہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟ ہاں، کبھی کبھار، مگر آج کل تو اسکول کا ہوم ورک اور بعد میں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعد دوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اور ٹیکسٹ پیغامات نے تو تمہیں عجیب اجنبیت پیدا کر رکھی ہے، بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس ٹیبلٹ کی فرصت کہاں؟

تم نے مجھے "مدر ڈے" پر "وش" کر کے جی تو مان لیا اور اس میں کوئی ٹک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ چلو آج ہم دونوں ایک بیوی بری روایت کو قائم کرتے ہیں۔ کہانی سنو گے؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کر دی۔ "ضرور، کیوں نہیں، مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سننے ہوئے"۔ انہوں نے ایک کہانی سنائی۔ آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کے لیے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسپاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ لڑکی بولی: میں اپنی ماں کے لیے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف پچاس پنس ہیں جبکہ گلاب کی قیمت دو پاؤنڈ ہے۔ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا، میرے ساتھ اندر چلو میں تمہیں گلاب دلا دیتا ہوں۔ اس نے بچی کو گلاب خرید کر دے دیا اور اپنی ماں کے لیے پھولوں کا آرڈر بک کر دیا۔ دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ بس پلیز! لڑکی نے جواب دیا آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کر لیا اور ایک گل دست لے کر فوری اپنی ماں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آواز پکپکانے لگی تو میں نے اپنی جھلی گردن اٹھا کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے منہ پھیر لیا کہ میں ان کی آنکھوں کی چٹلی نہ کھڑکوں۔ سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو؟ لکھتا ہے جو نیچے اپنی ماؤں سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں اب کیا وہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کر ہی محبت کا اظہار کریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح جینا.....! "اس سوال کا ہے کوئی جواب آپ کے پاس؟

اگر نہیں تو پھر جلدی کیجئے کہ ہمارے لئے تو ہر دن "مدر ڈے" ہے۔

خبر کھیت میں جیون کی اک دیکھاری بوڑھی ماں

بویا نہیں، جو کاٹ رہی ہے



اس اتوار کو بھی بی بی ہوا۔ میں چھت پر کھڑا نہیں دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کبھی آرام کرتی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بیٹھی آسمان کو دیکھتی ہیں۔ بس ایک دفعہ میں نے انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتے دیکھا ہے اپنی سفید چادر سے۔ شوہر کا انتقال تو بہت پہلے ہو گیا تھا، پانچ بیٹوں کی ماں ہیں وہ اور وہ سب کے سب باہر متیم ہیں۔ شاید وہ بچوں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا پاکستان آ رہا ہو تب ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پورے محلے کو بتاتی پھرتی ہیں: وہ کینیڈا والا آ رہا ہے۔ اور پھر وہ دن بھی آ جاتا ہے جب ان کا لخت جگر پگھلتا ہے کچھ دن تک رہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک دن اس شخص کی وہ تو آتے ہی اپنے بچوں کو گھسنے پھرانے لگتا ہے، میرا بچہ تو پھر بھی مجھے نہیں ملتا، پھر وہ واپس چلا جاتا ہے اور ماں کی اداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ جن بیٹوں کے بیوی بچے باہر ہیں وہ تو کئی کئی سال کے بعد آگاتے ہیں تو ان کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری ضرور ہوتی ہے جس میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ پاکستان کے فلاں وقت اسے ہر حال میں اپنی بیوی بچوں کو فون ضرور کرنا ہے، بیوی بچوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست الگ ہوتی ہے جن کی خریداری میں سارا دن بھٹکتے کے بعد جب واپس گھر لوٹتا ہے تو بوسوں کی منتظر ہاں کے سامنے اپنی جھکات کا اظہار کر کے لینے کی کوئی جگہ ڈھونڈ کر بے خبر سو جاتا ہے اور ماں باہر دوسرے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے..... یہ ہے ان کی زندگی۔

سنا ہے کہ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں، ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتا کہ یوٹوٹا کیا کھانے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ ایک دفعہ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے روک کر میرے گل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ مجھے جہاں ان کی علمی گفتگو نے حیران کر دیا ہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کر دیئے۔ میں جتنی

دیر پاکستان میں رہا ہوں ان سے جی پھر کر باتیں کرتا ہوں، ان کی ڈیڑ ساری باتیں سننا ہوں جو وہ سارا سال میرے لئے جمع کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ میں جب ٹیلیفون پر ان کو سلام کرتا ہوں تو ان کی خوش گامی سے میرا دل معطر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن مختصر سی بات کر کے یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کا زیادہ بل آئے گا۔ آؤ گے تو خوب باتیں کریں گے۔

پانچ سال پہلے انہی دنوں میں پاکستان میں تھا۔ آہستہ آہستہ سورج چڑھنے لگا، بجلی نہیں تھی تو گری بڑھنے لگی اور پھر سارا مملہ وقت سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ بٹھلے بیٹے نے اٹھنے ہی آواز لگائی: "ماما آئی لو!" تب سب سے چھوٹے کی آواز آئی، بھائی میں آپ سے جیت گیا۔ میں نے ماما کو سب سے پہلے "وش" کیا۔ تم تو اپنے نمبر بڑھاتے رہتے ہو اور پھر دونوں میں توڑی دیر نکرا رہے تھے سمجھ میں

